ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

پاکستان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا بچوں کا مقبول ترین ہفت روزہ

بچّوں کا اسلام

1046

اتوار 7 صفر 1444ھ
مطابق 4 ستمبر 2022ء

دوسرا مورچہ

اسلام کے خلاف تدبیر کرنے والوں کا انجام!

القرآن

جو لوگ بری بری تدبیریں کرتے ہیں کیا ایسے لوگ پھر بھی اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں غرق کردے یا ان پر ایسے موقع سے عذاب آپڑے جہاں ان کو گمان بھی نہ ہو یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے، یہ لوگ خدا تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لے، سو تمہارا رب شفیق مہربان بڑا ہے۔ {سورہ نحل: 35 تا 47}

اللہ کی تدبیر اور عذاب سے بے خوف ہوجانا

الحدیث

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تکیہ کا سہارا لگائے تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ کبیرہ گناہ کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اللہ تعالیٰ کی تدبیر اور عذاب سے بے خوف و لاپروا ہوجانا'' پھر آپ ﷺ فرمایا: ''یہ (یعنی اللہ کے عذاب سے بے خوف ہونا) سب کبیرہ گناہوں میں سے عظیم کبیرہ گناہ ہے۔'' {الزواجر عن اقتراف الکبائر}

جو چُپ رہا!

دستک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

وہ دین و دنیا کے اعتبار سے بڑے لوگوں کی مجلس تھی۔

ناچیز بھی موجود تھا۔

تعارف ہوا تو مسکراتے ہوئے کہا گیا: ''آپ بھی کچھ کہیے ناں۔''

کہنے کو بہت کچھ تھا، دل بھرا ہوا تھا اور کوئی خوف بھی مانع نہ تھا کہ اُن دنوں بوجہ کم عمری دل بھی بہت بے باک تھا۔

مگر کسی نادیدہ قوت نے جیسے منہ کس کر بند کردیا۔

کچھ عرصے تک سوچتے رہے کہ کاش! دل کی بات کرلیتے۔

مگر قارئین! سچی بات بتائیں، کئی برس بعد جب تحمل آیا تو اب لاکھ لاکھ شکر ادا ہوتا ہے کہ اُس وقت چپ رہے۔

جی ہاں قارئین! اِس ناچیز کی زندگی کا سچ تو یہی ہے کہ ہمیشہ کسی طعن کے موقع پر، کسی کو کھری کھری سنانے کے وقت، بول اٹھنے پر ہی پچھتاوا ہوا، نہ بولنے پر کبھی نہیں۔

خصوصاً اندر سے جب کوئی طاقت بولنے سے روکتی ہو تو تمام تر جوش و خروش کے باوجود اُس کی بات مان کر چپ رہنا چاہیے۔

سچ مچ اس چپ رہنے میں بڑی عافیت ہے۔

جیسا کہ ابی العتاہیہ کا مشہور قول ہے:

ما ان ندمت علی سکوتی مرۃ ولقد ندمت علی الکلام مرارا

''میں خاموش رہنے پر کبھی نہیں پچھتایا لیکن اپنے بولنے پر کئی مرتبہ پچھتایا ہوں۔''

ایک اور اللہ والے کا قول یاد آیا، فرماتے ہیں:

''بولنا اگر چاندی ہے تو خاموشی سونا ہے۔''

نیز ایک اور عارف باللہ نے لکھا ہے کہ خاموشی زینت اور سلامتی ہے۔

اور یہ تو امتیوں کی باتیں ہیں، اولین و آخرین کے سردار، عارفین کے آقا حضور خاتم النبیین ﷺ کے فرمان عالی شان کے بعد تو بات ہی ختم ہوجاتی ہے، فرمایا جس کا مفہوم ہے:

''جو چپ رہا، اس نے نجات پائی۔''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صرف حق کی دعوت دینے، کسی مسلمان کی جائز سفارش کرنے، اسے رسوائی سے بچانے، اس کے لیے سچی گواہی دینے، بھلی بات کہنے اور برائی سے روکنے، نیز اپنا ذکر کرنے اور اپنے بندوں کی حاجت پوری کرنے اور ان کی جائز خوشی کے لیے ہی زبان کھولنے کی توفیق دے، آمین!

والسلام محمد فیصل شہزاد

جواہرات سے قیمتی

عائشہ عبدالغفور۔ کبیر والا

☆ خوش رہنے کا سب سے اچھا اصول یہ بھی ہے کہ جہاں لگے کہ آپ کی جگہ نہیں، وہاں خاموشی سے خود کو الگ کرلو۔

☆ پریشانی میں مذاق، خوشی میں طعنہ مت دو، کیونکہ اس سے رشتوں میں موجود محبت ختم ہوجاتی ہے۔

☆ جو انسان جتنا خاموش رہتا ہے، وہ اپنی عزت کو اتنا محفوظ رکھتا ہے۔

☆ کچھ لوگوں کو ہماری ضرورت نہیں ہوتی، وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں۔

☆ اپنی زندگی ایسے جیو کہ اللہ کو پسند آجاؤ، دنیا والوں کی سوچ تو روز بدلتی رہتی ہے۔

خط و کتابت کا پتا دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد کراچی
bkislam4u@gmail.com
021 366 099 83

سالانہ زرتعاون: اندرون ملک 1200 روپے بیرون ملک ایک میگزین 18000 روپے دو میگزین 20000 روپے

مُختصر پُراثر

وفا کے پیکر:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''مجھے اور میرے والد کو غزوہ بدر میں شمولیت کا موقع یوں نہیں مل سکا کہ ہم حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہے تھے۔ راستے میں قریش کے کفار نے دھر لیا۔ کہنے لگے تم محمد کے پاس جا رہے ہو؟ ہم نے جواب دیا نہیں ہم تو بس مدینہ کو جاتے ہیں (ان کا ساتھ دینا مطلوب نہیں)۔ انھوں نے ہم سے اللہ کے نام پہ عہد و پیمان لے لیا کہ تم صرف مدینہ ہی کو جاؤ گے اور محمد (ﷺ) کے ساتھ مل کر نہیں لڑو گے۔ فرماتے ہیں کہ جب ان سے جان چھڑا کر ہم آگے بڑھے تو حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔ سب ماجرا بیان کر کے پوچھا کہ بتلایئے اب ہم کیا کریں؟ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ہم ان کے خلاف تو اللہ پاک سے مدد مانگتے ہیں، اور جو عہد دیا اس کی ہم پاسداری کریں گے، پس ہم باپ بیٹا لشکر کو چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے۔''

یہ روشن مثال ہے کہ کیسے حضور علیہ السلام نے عہد کی پاسداری کا لحاظ ہمیشہ خود بھی رکھا اور اپنے ساتھیوں سے بھی کروایا۔ اگرچہ وہ وقت بڑی افرادی قلت کا تھا اور ایک ایک سپاہی اہم تھا مگر عہد نہ توڑنے دیا۔ (محمد اشتیاق۔ گوجرانوالہ)

کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر:

مولانا زاہد الراشدی صاحب لکھتے ہیں کہ ایک عزیز نظم پڑھ رہا تھا:

کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گیا

یہ امرِ واقعہ ہے کہ وہاں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ فضیلت بیان کی جاتی ہے کہ کعبے پر جب پہلی نظر پڑے تو اُس وقت جو دعا کی جائے، قبول ہوتی ہے، لیکن واقفین حال کہتے ہیں کہ اگر اس وقت ہوش و حواس قائم رہیں تب، ورنہ عام طور پر یاد نہیں رہتا۔ میں اس پر اپنا ذاتی واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی دفعہ میں عمرے کے لیے جانے لگا تو حضرت والد گرامی حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں عمرے کے لیے جا رہا ہوں، دعا فرما دیں۔

انھوں نے دعا فرمائی اور دعا کرتے ہوئے مجھے کہا کہ طواف کرتے ہوئے پہلے تین چکروں میں رمل کرنا ہوتا ہے، تُو رمل بھول جائے گا۔ میں نے کہا: ان شاء اللہ نہیں بھولوں گا۔ فرمایا، تُو بھول جائے گا، وہاں کوئی نہیں ہوش رہتا۔ میں نے کہا ان شاء اللہ نہیں بھولتا۔

پھر فرمایا، بھول جاؤ گے۔ اس پر حضرت ملا علی قاری کا واقعہ سنایا کہ مناسکِ حج پر احناف میں سب سے مفصل کتاب ملا علی قاری کی ہے۔ فرمایا، ملا علی قاری نے مناسک الحج لکھی، لوگوں میں عام ہوئی، پھر کسی موقع پر خود حج کے لیے گئے۔ طواف کر رہے تھے کہ ایک آدمی قریب آیا اور پوچھنے لگا: ''آپ مولوی لگتے ہیں، کیا آپ نے ملا علی قاری کی کتاب نہیں پڑھی؟''

ملا علی قاری صاحب نے پوچھا: ''اُس میں کیا لکھا ہوا ہے؟''

اس نے کہا: ''اس میں لکھا ہے کہ طواف میں تین چکروں میں رمل کرنا ہے، آپ رمل تو کر ہی نہیں رہے!''

ملا صاحب نے یہ واقعہ خود لکھا ہے۔ بہر حال والد صاحب کے سامنے تو میں نے کہہ دیا کہ اِن شاء اللہ نہیں بھولوں گا، لیکن والد صاحب کی یہ بات مجھے چوتھے چکر میں یاد آئی کہ میں نے تو رمل بھی کرنا تھا، کیونکہ تینوں چکر میں نے رمل کے بغیر کر لیے تھے۔ (ام احمد)

علمِ دین حاصل کرنے والوں کے لیے اہم نصیحت:

استاد محترم مولانا ہدایت اللہ دامت برکاتہم العالیہ نے دورانِ درس اپنا ایک واقعہ سنایا۔ فرمایا: ''ایک دفعہ میں اپنے گاؤں گیا تو وہاں اپنے بچپن کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوئی۔ ہم اکٹھے قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، پھر وہ پڑھائی سے بھاگ گیا اور زمینداری میں لگ گیا۔ اب جب ملاقات ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے بھینسوں کے گوبر سے بھری ہوئی ہاتھ والی ریڑھی پکڑی ہوئی تھی، جسے پھینکنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ مجھ سے بہت محبت سے ملا، پھر کہنے لگا: ''میرے ابا جی نے بھی مجھے مدرسے میں داخل کروایا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں بھی حافظ، قاری اور عالم بن جاتا اور آج میں بھی استری شدہ سفید کپڑے پہن کر اور سرمہ خوشبو لگا کر تم لوگوں کی طرح پھرتا۔ بس میری بدبختی اور محرومی کہ اس وقت میں گوبر پھینکنے جا رہا ہوں۔''

استاد محترم یہ واقعہ سنا کر فرمانے لگے کہ اللہ ربُّ العزت نے ہم لوگوں پر خاص طور پر یہ احسان فرمایا ہے کہ ہمیں کام ہی ایسا عطا فرمایا کہ کتاب اٹھا لو، کتاب پڑھ لو، وضو کر لو، نماز پڑھ لو، مسجد ہے، مدرسہ ہے، قرآن ہے، حدیث ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ کاغذ الٹ پلٹ کرتے ہیں تو وہ بھی اکثر ہمارے ہاتھوں کو زخمی کر دیتا ہے، جبکہ دنیا کے کام کاج کرتے کرتے لوگوں کے ہاتھ ایسے ہو جاتے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ آدمی کا ہاتھ ہے یا اینٹ پتھر۔ اِس لیے اللہ کی اس نعمت کی بہت شکر گزاری کرنی چاہیے، نیز صفائی، نظافت اور طہارت کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔

(فائزہ واجد۔ ابراہیم اکیڈمی)

ننھا مجاہد:

ہمارے جاننے والے جناب قاری عطاء اللہ ایک بار موبائل فون پر ختمِ نبوت کے موضوع پر کوئی ایمان افروز تقریر سن رہے تھے۔ ان کا ننھا بیٹا ابوبکر ان کی گود میں بیٹھا تھا۔ تقریر کے دوران میں ایک جیالے نے زوردار نعرہ لگایا: ''ختمِ نبوت......!''

اِدھر ننھے ابوبکر نے ہاتھ اٹھا کر جوش سے نعرے کا بھرپور جواب دیا:

''زندہ باد......!''

پانچ سالہ ننھے مجاہد کا ایمانی جذبہ دیکھ کر قاری صاحب چونک اٹھے۔ انھوں نے فرطِ مسرت سے اپنے بیٹے کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔

(محمد سفیان اکرم گورمانی۔ ٹبی قیصرانی)

☆☆☆

ایک پُرکیف سفر



محمد فضیل فاروق۔ میرپورخاص

۱۱ مارچ ۲۰۲۲ء بروز جمعہ،

میں فجر پڑھ کر آیا تو حسبِ معمول سیدھا واپس اپنی خواب گاہ میں جا کر لحاف میں دبک گیا۔

چند منٹ بعد ابو کمرے میں آئے، اور مجھے سوتا دیکھ کر بول اٹھے: ”ارے تم پھر سو گئے!“

”جی ابو! بس پندرہ منٹ میں اٹھ رہا ہوں۔“

میں نے تھوڑی سی اور مہلت مانگی۔

”ساڑھے سات بجے نکلنا ہے بھئی!“

”جی جی ابو! ابھی تھوڑا وقت ہے ناں۔“

مشہور ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے جانور کو کرائی گئی کھلائی پلائی اس کا وزن نہیں بڑھاتی، مگر میں نے ان پندرہ بیس منٹ میں وہ نیند پوری کر لی تھی، جو رات بھر میں نہیں کر پایا تھا۔

سفر تھا میرپورخاص شہر سے ۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاوں ”فضل بھمبھرو“ کی طرف۔ یہ نوکوٹ سے معمولی فاصلے پر ہے۔

قصہ یہ ہوا کہ پچھلے ہفتے جب چھٹیاں ہونے پر میں گھر واپس آیا تو رات کو میز پر ختم نبوت سے متعلق بات چل نکلی۔ میں نے ابو سے کہا کہ یہ بڑا احساس موضوع ہے اور ہم لوگوں نے اسے بہت ہلکا لے رکھا ہے۔ قادیانیوں کے جو دلائل ہیں وہ منطقی طور پر فلسفے کی بنیاد پر بہت مضبوط ہیں، عموماً ایک عام عالم بھی ان کے جوابات دینے سے قاصر ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں کراچی کے ایک بڑے مدرسے کے دورۂ حدیث کے طلبہ کا انہی کی درسگاہ میں ایک قادیانی مبلغ سے مناظرہ ہوا اور بلا مبالغہ طلبہ وہ مناظرہ ہار گئے۔“

ابو یہ سن کر بڑے حیران ہوئے۔ ظاہر ہے ہم سب ہی سمجھتے ہیں کہ قرآن کی آیت: (مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ)

اور حدیث مبارکہ: (اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ)

اُن کے ہر سوال اور ہر دلیل پر بھاری ہے، مگر وہ لوگ ان کی کیا تشریح کرتے ہیں، کبھی یہ جاننے کی کوشش کی!؟

اس بار ہمارے جامعہ، جامعۃ الرشید میں چھٹیوں میں ختم نبوت کا ایک ہفتے کا دورہ کروایا گیا تھا، جس کے لیے لاہور سے شبانِ ختم نبوت کے ماہر علماء تشریف لائے تھے۔ کچھ وجوہ کی بنیاد پر میں اسے مکمل تو نہ کر سکا، البتہ پہلے دن میں ضرور اس میں شریک تھا۔ انھوں نے مرزائیوں کے چند اعتراضات پیش کیے تھے، جس کے حاضرین میں سے کسی کے پاس جواب نہیں تھے، اور کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ہر درجے کے طلبہ موجود تھے۔

ان کے جوابات سن کر مجھے احساس ہوا کہ اس کے لیے الگ سے محنت بہت ضروری ہے۔ خاص طور پر طلبہ کرام کو اس میدان میں اترنا چاہیے۔

بہرحال! میری بات سن کر ابو بولے: ”اگلے جمعے کو ہماری ڈاکٹروں کی جماعت جا رہی ہے ایک جگہ، تم چلو ہمارے ساتھ، یہ ختم نبوت کے سلسلے میں ہی سفر ہے، یہاں عالمی مجلس ختم نبوت کے ساتھ معاونین کے طور پر ہم اُن علاقوں میں اکثر جاتے رہتے ہیں جہاں اُن کی محنت سے بہت سے لوگ پھر سے مسلمان ہو رہے ہیں، اتفاق سے اِس جمعے کو بھی جا رہے ہیں۔“

آج ہی وہ جمعہ تھا، ناشتے کے بعد ہم لوگ نکل پڑے۔

سفر کے ساتھیوں کا مختصر تعارف یہ ہے کہ 3 ڈاکٹر، جلد، آنکھوں اور بچوں کے اسپیشلسٹ، ایک ڈاکٹر آف فارمیسی (یہ یہاں میرپورخاص میں تھیلیسیمیا کے مریضوں اور پورے شہر کی خون کی ضرورت کے سیٹ اپ کو سنبھالے ہوئے ہیں، گویا ایک چلتے پھرتے بلڈ بینک ہیں پورے) ایک فیزیوتھراپی کے طالب علم، ایک ماسٹر صاحب، ایک بلدیہ کے ریٹائرڈ ہیڈ کلرک اور عالمی مجلس ختم نبوت کے میرپورخاص ڈویژن کے ذمے دار مولانا مختار احمد صاحب تھے۔

آج خوش قسمتی سے اشرف المدارس کراچی کے ایک سینئر استاذ مفتی طریق الاسلام صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ یہ یہاں حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب کے صاحب زادے مولانا مظہر صاحب کی خانقاہ اور مدرسہ مسیح الامت میں صرف ونحو کا دورہ کروانے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔

ساڑھے دس کے لگ بھگ ہم وہاں پہنچ گئے۔

ایک چھوٹی مسجد اور اس کے ساتھ ایک متصل مدرسہ بنا ہوا تھا۔ مدرسے میں تین کمروں میں الگ الگ ڈاکٹروں کے چیمبرز سیٹ کر دیے گئے تھے۔ جمعے کی نماز تک مریضوں کا تانتا بندھا رہا۔ ڈھیروں دوائیاں بھی مختلف کارٹن میں پیک ہم ساتھ ہی

لائے تھے۔ یہ پورا علاقہ نوکوٹ سے نصرت نگر، فضل بھمبھرو، نفیس نگر، محمد آباد اور ڈالی سے لے کر آگے کنری تک قادیانی آبادیوں سے بھرا ہوا ہے، اور یہ لوگ تقسیم ہند سے پہلے سے قادیانی چلے آرہے ہیں۔

جمعے کی نماز تک کوئی دو سو کے قریب مختلف امراض کے مریضوں کا علاج ہوا۔ اس کے بعد نماز کے لیے مسجد پہنچے۔ مولانا مختار صاحب ہی کا بیان تھا، انتہائی خوبصورت اور آسان انداز میں انھوں نے پہلے تو انسان اور باقی مخلوقات کا فرق سمجھایا، پھر عام انسان اور انبیاء کا اور پھر ان سب میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ ومقام سمجھاتے ہوئے نہایت مختصر اور آسان الفاظ میں عقیدۂ ختم نبوت سمجھایا۔ اس کے بعد آپ نے مرزا قادیانی کے صرف دو جھوٹ گنوائے۔ ایک محمدی بیگم سے نکاح والا اور دوسرا اپنی مکہ یا مدینہ میں موت کی پیش گوئی والا، اس کے بعد فرمایا کہ چونکہ نبی کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اِس لیے ثابت ہوا کہ مرزا جھوٹا ہے۔ سادہ لوگوں کے سامنے سادہ سے الفاظ میں بیان کرنا مولانا کی بہترین حکمت عملی رہی۔

اس کے بعد مولانا نے مسجد ہی میں سے ایک آٹھ دس سالہ بچے کو اشارہ کر کے کھڑے ہونے کو کہا، پھر فرمایا: ''یہ آپ کے اگلے گاؤں کا بچہ ہے، اس نے جب مرزا قادیانی کے یہ جھوٹ سنے تو گھر جا کر اپنے والد سے کہا: ''ابو! مرزا قادیانی جھوٹا تھا، ہم جھوٹے کے دین پر نہیں چل سکتے۔''

باپ کے دل پر بھی بات اثر کر گئی اور دونوں باپ بیٹے مسلمان ہو گئے۔

یہ وہ لمحہ تھا، جب میری آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں۔

بعد میں پتا چلا کہ پورا خاندان ایک ایک کر کے الحمدللہ مسلمان ہو گیا۔ یہ کوئی چالیس بچاس نفوس کی تعداد تھی۔

ایک آدھ واقعات اور آپ نے سنائے، لیکن میرے صفحے کا طول مجھے یہاں نقل کرنے کی اجازت نہیں دے رہا، اور آج ہمارا موضوع بھی کام کی ''کیفیت'' ہے کام کے ''نتائج'' نہیں۔

جمعے کے بعد پر تکلف ظہرانے کا بندوست تھا۔ سرسوں کا ساگ، مرغی کا سالن، سادی گھر کی روٹیاں اور سفید چاول، اُس کے ساتھ نمکین لسی۔

کھانے کے بعد کافی تعداد میں لوگوں میں راشن کے بورے تقسیم کیے گئے۔ تحقیقات کر کے پہلے سے اِن گھرانوں کی نشاندہی کر لی گئی تھی کہ یہ لوگ واقعی مستحق ہیں۔ انھیں الگ سے بلا کر ایک ایک کر کے دے دیے گئے۔ ایک سفید ریش بزرگ کو اُن کی بیٹی کے جہیز کی مد میں ایک لفافہ بھی تھمایا گیا۔

اس دوران میں بھی مریضوں کو دیکھنے کا سلسلہ جاری ہی رہا۔

دراصل اڑوس پڑوس کے گاؤں کے لوگوں کو خبر پہنچی تو ان کے مریض بھی چلے آئے تھے۔

چائے کا دور چلنے والا تھا کہ میں چپکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا کہ چائے تو اپنے مزاج کو بھاتی نہیں۔ باہر نکل کر آئس کریم کا خیال آ گیا تو اس کی کھوج میں نکلا اور اس گاؤں میں بھی ایک آئس کریم والا ایجاد کر کے ہی دم لیا۔

یہ علاقہ تھر کے کافی قریب ہے۔ ہمیں مولانا صاحب نے تھر کی دور سے حدود بھی دکھائی۔

چائے سے فارغ ہوئے تو وہ گاڑی جو ہم کرائے پر لائے تھے، وہ اپنے ڈرائیور سمیت کہیں کھوگئی۔ خوب تلاش کیا، مگر مل کر ہی نہ دی۔ سنگلز تھے نہیں کہ بندہ کال ہی کر لیتا، بالآخر مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کروایا گیا:

''حضرات! ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیے، ڈاکٹر حضرات کی جماعت جس گاڑی میں آئی ہے وہ گاڑی اپنے ڈرائیور سمیت لاپتا ہے، جس بھائی کو کہیں ملے تو اسے رستہ بتا کر مسجد کی طرف چلتا کرے۔''

اعلان تو سندھی میں ہوا تھا، البتہ اُس کا لب لباب یہی تھا۔

اچھا یہاں ایک اور خوش گوار بات کا ذکر بطور تحدیث بالنعمة کے ذکر کرتا چلوں کہ وہاں کسی کام سے ابو نے مجھے نام سے پکارا تو وہیں قریب ہی وہاں کی مسجد و مدرسہ کے ذمے دار جناب مولانا کامل صاحب بھی کھڑے تھے۔ انھوں نے چونک کر مجھ سے پوچھا: ''آپ کا نام کیا ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''محمد فضیل!''

اس پر وہ بولے:

''بچوں کا اسلام میں جو لکھتے ہیں، کہیں وہ آپ ہی تو نہیں......!؟''

یقین کیجیے، مجھے اِس بات پر بہت خوش گوار حیرت ہوئی کہ یہاں اتنے دور دراز دیہات میں بھی ہمارے دونوں محبوب رسالے پہنچ رہے ہیں، سوچا اس خوشی میں آپ لوگوں کو بھی شامل کر لوں۔

تھوڑی دیر کے بعد ہماری گمشدہ گاڑی آ گئی تو ہم وہاں سے چل پڑے۔ زیادہ نہیں بس دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہی ہماری اگلی منزل تھی۔ (جاری ہے)

آئیے! دین سیکھیے

8

مولانا ہارون الرشید عادل

سوال: اگر مسجد میں جماعت کی نماز کے دوران اگلی صف میں سے کوئی شخص نماز توڑ کر صف سے نکل جائے یا کسی اور وجہ سے صف میں ایک شخص کی جگہ خالی ہو تو اس خالی جگہ کو پر کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: دورانِ نماز اگر اگلی صف سے کوئی نمازی نکل جائے تو پچھلی صف کے نمازی کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر خلا پر کردے۔ اگر پچھلی صف کے نمازیوں میں سے کوئی آگے نہ بڑھے تو بعد میں آنے والے فرد کو چاہیے کہ وہ اس خلا کو پر کردے۔ چاہے اس کے لیے نمازی کے سامنے سے گزرنا یا صف کو چیر کر جانا کیوں نہ پڑے۔ خلا پر کرنے والا مذکورہ عمل کی وجہ سے گناہ گار نہ ہوگا۔

(استفادہ: دار الافتا: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)

میر حجاز

22

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

''تمھیں شرم نہیں آتی ایک ننھی سی جان پر ظلم کرتے ہوئے۔''

یہ کہتے ہوئے بوڑھی امِ انمار بنو عامر کے ان بدوؤں میں جا گھسی، جو ایک دس بارہ سالہ بچے کو بے دردی سے مار رہے تھے۔

امِ انمار نے کسی کے کپڑے کھینچے اور کسی کو کھینچ کر ہٹایا اور اس بچے کو خود سے لپٹا لیا۔

''بی اماں! آپ ہمارے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائیں۔''

بنو عامر کے ایک آدمی نے اس اچانک مداخلت پر امِ انمار کو غصیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور تمھیں ایک معصوم پر یونہی ظلم کرنے دوں۔''

امِ انمار نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

''بی بی جی! اگر تم سرزمین حرم میں نہ ہوتیں تو تمھیں اس مداخلت کا ہم مزا چکھا دیتے۔ آئی بڑی مظلوم کی حمایتی!''

''جس سرزمین حرم کے لحاظ میں میرے اوپر ہاتھ اٹھانے سے تم گریز کر رہے ہو، اس معصوم بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ حرم تمھیں کیوں یاد نہیں رہتا۔ اپنے چوڑے چکلے سینوں میں بہادری کی نمائش اور بازوؤں کی قوت کے اظہار کے لیے تمھیں ایک بچہ ہی ملا تھا جسے تم نے نشانۂ ستم بنایا ہوا ہے۔''

''اگر اُس کے کھلانے پلانے اور دیگر اخراجات کا بوجھ تم پر ہوتا تو تم بھی اِس بچے پر ترس نہ کھاتی۔ اللہ کی قسم! یہ بالکل ناکارہ غلام ہے، ہم پر ہر طرح کا بوجھ تو ڈالتا ہے لیکن فائدہ نہیں دیتا، بلکہ ہمارے ساتھ چلنے سے بھی انکار کرتا ہے جیسے یہ شہر اسے بہت پسند آگیا ہے۔ حالانکہ اِس شہر کا کوئی باشندہ بھی اسے خریدنا پسند نہیں کرتا۔''

''اس میں ایسی کیا کمی ہے؟ چنگا بھلا تو ہے۔'' امِ انمار نے کہا۔

''تو پھر تم اسے خرید کیوں نہیں لیتیں؟'' بنو عامر کا ایک آدمی بولا۔

''کیا لوگے اس کا؟'' امِ انمار نے کہا۔

دو ہزار درہم۔

''اس ناکارہ کا؟'' امِ انمار نے ان کا جملہ انھی پر اچھالا۔

اس میں کیا کمی ہے، چنگا بھلا تو ہے۔''

بنو عامر نے بھی قیمت خرید بڑھانے کے لیے امِ انمار کے جملے کا سہارا لیا۔

اس کے بعد ان کے درمیان کافی دیر بھاؤ تاؤ ہوتا رہا۔ بالآخر امِ انمار نے غلام بچے کو سستے داموں خرید لیا۔ بنو عامر مجد کی طرف پلٹ گئے اور امِ انمار اس دبلے پتلے غلام کو پکڑے بنی زہرہ کے محلے میں اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

امِ انمار بنی زہرہ کے مردوں اور عورتوں کے جس مجمع کے پاس سے بھی گزرتی تو وہ ہنس کر کمزور بچے پر پھبتی کستے۔

''یہ میرا خریدا ہوا غلام ہے، کھا پی کے تنومند ہو جائے گا۔ میری خدمت کرے گا اور میرے بچے کے ساتھ کھیلے گا۔'' امِ انمار جواب دیتی۔

گھر پہنچ کر امِ انمار نے بچے کو نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے، کھانا کھلایا۔

بچے کے کملائے ہوئے چہرے پر بشاشت نمایاں ہو گئی۔

اس کا بیٹا عبدالعزیٰ اور یہ غلام بچہ جلد ہی مانوس ہو گئے۔

اگلے دن وہ انھیں کھیلتا چھوڑ کر شہر میں اپنے کام کے لیے نکل گئی۔

مکہ میں گھروں کے چکر لگاتی اور اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے روزی کماتی تھی۔

آج وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی:

''امِ انمار! ترا بھلا ہو، کل تک تو تو صرف اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالتی تھی، اب ایک اور بچے کی کفالت بھی تیرے ذمے آ پڑی ہے، لیکن خیر فکر مت کر، یہ جب ذرا بڑا ہو جائے گا تو تیرے لیے کما کر لائے گا اور مصیبت کے وقت تیری مدد کرے گا۔''

امِ انمار کا تعلق مکہ کے قبیلہ بنو خزاعہ سے تھا۔ اُس نے بنی زہرہ کے ایک حلیف سے شادی کر لی تھی۔ اب وہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکی تھی۔ شام کے وقت جب وہ گھر واپس آئی تو دونوں بچوں کو کھلانے پلانے کے بعد وہ اس بچے سے باتیں کرنے لگی: ''تمھارا نام کیا ہے بیٹے!؟ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔''

''خباب۔'' بچے نے جواب دیا۔

''اچھا بیٹا! تم کس قبیلے سے ہو؟''

''مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔''

''اچھا بیٹا! یہ بتاؤ کہ تمھاری ماں کا کیا نام ہے؟''

یہ سننا تھا کہ بچہ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ بڑھیا کا دل پسیج گیا۔

اس نے سوالات بند کر کے اس کے آنسو پونچھے اور اس کا دل بہلانے لگی۔

کئی دن تک اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ بالآخر کئی دن کی محنت کے بعد وہ اس کی کہانی سن پائی۔

قصہ یہ تھا کہ بنی عامر کے وہ لوگ دھوکے سے اس کے خاندان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس روز اہل قبیلہ وہاں موجود نہ تھے۔ خباب کے والد ارت سے جتنا ممکن تھا، اس نے حملہ آوروں کا تنہا مقابلہ کیا، لیکن انھوں نے اس کی بیوی، نوجوان بیٹی اسما اور اس بچے کے سامنے ارت کو قتل کر دیا۔ مال واسباب لوٹ کر گھر والوں کو قیدی بنا لیا۔ خباب کی ماں کو کسی عرب قبیلے کے ہاتھ بیچ دیا اور بہن کو دوسرے قبیلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ باقی مال واسباب اور خباب کو بیچنے کے لیے مکہ میں لے آئے۔ مال واسباب تو بہت جلد فروخت ہو گیا لیکن اس بچے کی زیادہ بولی لگانے والا کوئی گاہک انہیں نہ ملا حتیٰ کہ امِ انمار نے اسے خرید لیا۔

امِ انمار نے یہ کہانی سنی تو اسے غلاموں کی طرح نہیں، اپنے بیٹے عبدالعزیٰ کی طرح رکھا کہ وہ اب خود کو امِ انمار کا بیٹا سمجھنے لگا۔

جب وہ کچھ کام کاج کے قابل ہو گیا تو امِ انمار نے اسے ایک لوہار کے پاس ہتھیار سازی کا کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا۔

☆......☆

"کل رات محفل میں بڑا مزا آیا۔"

محمد بن عبداللہ کے ساتھی چرواہے نے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"گانے بجانے والی مغنیات کے علاوہ داستان گو آئے ہوئے تھے۔ ہر آدمی جھوم رہا تھا۔ تمھیں کیا بتاؤں کہ کتنا مزا آیا۔ تم نے تو ایسی محفل طرب و نشاط کبھی دیکھی نہ سنی۔"

اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا: "ابن عبداللہ! تم میری جگہ کئی بار رات کو ریوڑ کی نگرانی کر چکے ہو، آج رات تم ہو آؤ۔ میں تمھاری جگہ جاگ لوں گا۔" نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ساتھی نے اصرار کیا تو محمد بن عبداللہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

مکہ میں راتوں کو طرب و نشاط کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں۔ ان محفلوں میں گانا بجانا ہوتا۔ داستان گو ساری ساری رات افسانوی و رومانوی داستانیں سناتے اور لوگ رات بھر جاگتے رہتے۔

محمد بن عبداللہ اہلِ مکہ کی بھیڑ بکریاں معاوضے پر چرانے لگے تھے۔

عربوں کی زندگی بے حد سیدھی سادی اور تہذیب و تمدن کے تکلفات سے نا آشنا تھی۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے بھی اونٹ اور بکریاں چراتے تھے۔ گلہ بانی عربوں کا شریفانہ پیشہ تھا۔ جناب ابو طالب کی جتنی اولاد تھی، مالی حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ تجارت سے جو بچت ہوتی تھی وہ بچوں کی کفالت اور حرم کے مہمانوں کی مہمان نوازی میں خرچ ہو جاتی تھی۔ محمد بن عبداللہ کو گوارا نہ تھا کہ وہ اپنے چچا پر بوجھ بنیں، چنانچہ اپنے چچا کا بوجھ سہارنے کے لیے انھوں نے اہلِ مکہ اور بنی سعد کی بکریاں چند قیراط پر چرانا شروع کر دی تھیں۔

گرمیوں کے دنوں میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رات کو عموماً جنگل میں ہی رکھے جاتے تھے، اس لیے کئی کئی ریوڑوں کے چرواہے رات کو اپنے ریوڑوں کو اکٹھا کر لیتے تاکہ مل جل کر موذی جانوروں اور ڈاکوؤں سے اِن ریوڑوں کی حفاظت کر سکیں۔

محمد بن عبداللہ جب مکہ میں داخل ہوئے تو انھیں نیند نے آ لیا۔

رات بھر ایک جگہ سوتے رہے۔ جب سورج بلند ہوا تو ان کی آنکھ کھل گئی۔

وہ اٹھے اور اپنے ساتھی کے پاس جنگل میں آ گئے۔

"کہو، کیسی رہی رات؟" ساتھی چرواہے نے پوچھا۔

آپ نے بتایا کہ نیند کی وجہ سے شرکت نہ ہو سکی۔

وہ بولا: "دیکھو آج رات یہ موقع ضائع نہ کرنا، تم ضرور جانا۔"

اگلی رات محمد بن عبداللہ پھر روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک نغمے کی آواز کانوں میں پڑی مگر پھر آپ پر ایک بار پھر نیند طاری ہو گئی۔

آپ کی طبیعت شروع سے لہو و لعب کی طرف مائل نہ تھی، کچھ قدرت بھی آپ کو ان چیزوں سے بچا رہی تھی۔ (جاری ہے)

مسافرانِ آخرت کی تمثیل اور تقسیم

دنیا میں مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کشتی پر کچھ آدمی سوار ہو اور کشتی کسی جزیرے کے کنارے پر آ ٹھہرے اور کشتی کا ملاح سواریوں کو اجازت دے دے کہ جاؤ جزیرے میں اتر کر اپنی ضرورتیں پوری کر آؤ، مگر ہوشیاری سے کام لینا۔ جگہ خطرناک ہے اور ابھی سفر دور دراز سر پر ہے۔ غرض سواریاں اتریں اور ادھر ادھر منتشر ہو کر کئی اقسام پر منقسم ہو گئیں۔ بعض تو ضروری حاجت سے فارغ ہوتے ہی لوٹ پڑے اور فضول وقت گزارنا ان کو اچھا معلوم نہ ہوا۔ واپس دیکھا کہ کشتی خالی پڑی ہے، لہٰذا اپنی پسند کے موافق ساری کشتی میں اعلیٰ درجہ کی ہوادار اور فراخ جگہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئے۔

اور بعض جزیرہ کی خوشگوار ہوا کھانے اور خوش الحان پرندوں کی سریلی آوازوں کے سننے میں لگ گئے۔

بعض سبز مخملی فرش اور رنگ برنگ کے پھول بوٹوں اور طرح طرح کے پتھروں اور درختوں کی گلکاریوں میں مشغول ہو گئے مگر پھر جلد ہی ہوش آ گیا اور فوراً کشتی کی جانب واپس ہوئے یہاں پہنچ کر دیکھا کہ جگہ تنگ رہ گئی ہے اور اچھی جگہوں پر ان سے پہلے آ جانے والے لوگ بستر لگا چکے، لہٰذا اس تنگ ہی جگہ میں تکلیف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

اور چند لوگ اس جزیرہ کی عارضی بہار پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ خوشنما پتھروں اور طرح طرح کے پھول پودوں کو چھوڑنے کو ان کا دل ہی نہ چاہا۔ پس ان کا بوجھ لاد کر انھوں نے اپنی کمر پر رکھا اور سمندر کے کنارے پہنچے کہ کشتی پر سوار ہوں دیکھا کہ کشتی تو بھر چکی ہے کہ اس میں نہ اپنے بیٹھنے کی جگہ ہے نہ فضول بوجھ رکھنے کا کوئی امکان ہے۔ اب حیران ہیں کہ کیا کریں۔ ادھر تو بوجھ کے پھینکنے کو نفس گوارا نہیں کرتا اور ادھر اپنے بیٹھنے تک کو جگہ نہیں ملتی۔

جویریہ آرا محمد بنت غلام مصطفیٰ۔ کوئٹہ

نہایت دقت کے ساتھ ایک نہایت تنگ جگہ گھس بیٹھے اور کنکریوں پتھروں کے بارِ گراں کو اپنے سر پر لاد لیا۔ اب ان کی حالت کا تم ہی اندازہ کر لو کہ کیا ہوگی؟ کمر الگ دکھے گی گردن جدا ٹوٹے گی اور جس مصیبت و تکلیف کے ساتھ وقت کٹے گا، اس کو ان کا ہی دل خوب سمجھے گا۔

اور بعض لوگ جزیرہ کے دل افروز حسن پر ایسے عاشق ہوئے کہ کشتی اور سمندر سب بھول گئے۔ پھول سونگھنے اور پھل کھانے میں مصروف ہو گئے۔ خبر ہی نہ رہی کہا جانا ہے یہاں تک کہ درندوں اور موذی جانوروں کی غذا بننا ہے۔ آخر جب سب کے بعد بادل نخواستہ ساحل پر پہنچے تو کشتی میں نام کو بھی جگہ نظر نہ آئی۔

تھوڑی دیر بعد کشتی لنگر اٹھا کر وہاں سے چل دی اور یہ لوگ کنارہ پر کھڑے حسرت بھری نظروں سے اپنے ہمراہوں کو دیکھتے رہ گئے۔

آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ کے درندوں نے ان کو پھاڑ ڈالا اور موذی جانوروں کے ان کے نازک اور خوب صورت بدن کے ٹکڑے کر دیے۔

یہی حال بعینہٖ دنیا داروں کا ہے اب تم خود غور کر کے سمجھ لو کہ کن لوگوں پر کون سی مثال چسپاں ہوتی ہے۔ (کتاب تبلیغ دین)

حافظ عبدالرزاق خان۔ ڈیرہ اسماعیل خان

دوسرا مورچہ

''ہاں شفقت! ہے کوئی خیر کی خبر؟''
اڑسٹھ سال کے بڈھے کھوسٹ نے وھیل چیئر پر اونگھتے ہوئے اپنے بھتیجے سے پوچھا۔
''انکل! آج تو میں آپ کے لیے ایسی خبر لایا ہوں کہ آپ پھر سے تیس برس کے کڑیل جوان بن جائیں گے۔'' شفقت نے قریب آ کر بتلایا۔
''تو اب سنا بھی دے پھر! دیر کا ہے کی۔''
بڈھے نے مفلوج دھڑ کو حرکت دینے کی کوشش کی۔
''واہ جی! ایسے نہیں بتلاؤں گا، پہلے وعدہ کریں کہ مجھے ٹریٹ دیں گے۔''
شفقت نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''اتنی کنجوسی اچھی نہیں انکل! ہم آپ کو جوان کر رہے ہیں اور آپ اپنی جیب کو ہوا بھی نہیں لگوا رہے۔''
''اچھا بھئی یہ لو! اب سناؤ جلدی۔''
بڈھے نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
''اونہہ...... صرف پانچ سو...... حالانکہ خبر ایسی ہے کہ پچاس ہزار بھی کم ہوں۔''
شفقت نے منہ بنایا۔
''آخر ایسی کون سی خوش خبری ہے جو تمھیں پانچ سو بھی تھوڑے نظر آ رہے ہیں؟''
بڈھے کی حیرت بڑھ رہی تھی۔
''دیکھیں انکل! خبر اتنی خوش کن ہے کہ آپ اڑسٹھ سال کے بڑھاپے سے نکل کر تیس سال کے جوان بن جائیں گے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مائی کا لعل ہے جو کھربوں روپوں کے بدلے آپ کی جوانی آپ کو لوٹا دے؟''
''چلو مان لیا۔ پانچ سو کم ہیں۔ خوشخبری تو سناؤ۔ یقین مانو اگر وہ خبر دل کو بھلی معلوم ہوئی تو منہ مانگا انعام دوں گا۔'' بڈھے نے یقین دہانی کرائی۔
''سوچ سمجھ کر وعدہ کریں انکل! بھلے سے میرا منہ بہت چھوٹا ہے مگر کوئی ایسا انعام نہ مانگ لوں کہ آپ اپنی بات سے پھر جائیں۔'' شفقت نے جھریوں بھرے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔
''کمال ہے تجھے یقین ہی نہیں آ رہا۔''
''اصل میں خوش خبری اتنی بڑی ہے کہ آپ خوشی کے مارے اچھل ہی پڑیں گے۔''
''ارے یہ تو ہم کب سے چاہ رہے ہیں کہ اچھلیں، مگر اس فالج نے تو ناکارہ ہی کر دیا ہے۔ اچھا شاباش پہیلیاں نہ بوجھواؤ، جلدی سے وہ خبر سناؤ۔''
بڈھے کے لہجے میں تمنا تھی۔
''اچھا تو پھر سنیں! ندیم بیگ نے آج ہی پوسٹ شیئر کی ہے کہ کئی دہائیوں کے بعد آخر مرزائیوں کی قربانیاں رنگ لے آئیں۔ عالمی مجلس تحفظِ ختم نبوت دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔''
''کیا کہا؟ بھئی ایسے نہیں ہو سکتا۔ ذرا غور سے پڑھ کر سناؤ۔'' بڈھے کو جیسے یقین ہی نہیں آیا۔
''خبر تو یہی ہے جو میں نے سنائی۔''
''یہ بے پر کی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی تاکہ احمدی کچھ دیر کے لیے خوش ہو جائیں اور پھر حقیقت معلوم ہونے پر ان کے چہروں پر کالک چھٹ جائے۔''
بڈھے نے وھیل چیئر میں پڑے پڑے خدشہ ظاہر کیا۔
''تو کیا آپ کو یہ خبر جھوٹی لگتی ہے؟''
''سو فیصد جھوٹی بلکہ ایک سو ایک فیصد۔''
بڈھے کے لہجے میں یقین تھا۔
''تو گویا میرا منہ مانگا انعام ضائع؟''
شفقت نے یاسیت میں ڈوبتے ہوئے کہا۔
''بھئی اگر یہ خبر واقعی سچی ہوتی تو یقیناً تم منہ مانگے انعام کے مستحق تھے، مگر میری عمر میرا تجربہ اس طرح کی خبر سننے سے انکاری ہے، مطلب ہے میرا دماغ یہ خبر قبول نہیں کر رہا۔''
''ندیم بیگ بلا تحقیق پوسٹ شیئر تو نہیں کرتے۔ خیر کل ان سے تفصیل معلوم کر کے آپ کو آگاہ کروں گا۔'' شفقت نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔
''ہاں ہاں ٹھیک ہے، کنفرم کر کے بتانا، مجھے انتظار رہے گا۔''
بڈھے نے اسے تسلی دیتے ہوئے تھپکا۔

☆......☆

''کل چنیوٹ میں انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ ہے وہ کل والی خبر۔''
شفقت نے مسکراتے ہوئے اپنے بڈھے انکل کو تفصیل بتائی جو کل سے بے تاب تھا۔
''ہوں...... پھیر دیا ناں میرے سارے ارمانوں پر پانی۔''
''ارمان؟ کون سے ارمان؟''
شفقت حیران تھا۔
''کل تیری خبر کو سچ تصور کر کے سہانے خواب دیکھتا رہا، رات بھر مارے خوشی کے کروٹیں بدلتا رہا، حالانکہ دھڑ ساتھ نہیں دے رہا تھا مگر دل کو خوش تو کرنا تھا ناں، کہیں خبر سچی ہی نہ ہو، اس خیال سے بہت ڈھارس سی بندھ گئی تھی، مگر جو خبر تو نے اب سنائی ہے، یہ تو انتہائی مایوس کن ہے۔''
''انکل! آپ خوش کن خبر کو مایوس کن کہہ رہے ہیں، حالانکہ تمام احمدی آج مٹھائیاں تقسیم کر رہے ہیں کہ ہمارے دشمنوں کی صف میں اتحاد نہ رہا۔''

شفقت نے دونوں ہاتھ کھولے۔

''مت ماری گئی ہے احمدیوں کی۔ سالوں کی عقل کہاں چلی گئی؟ ۱۹۴۹ء سے لے کر آج تک کوئی ایسی بات پیدا نہیں ہوئی کہ مجلس میں دھڑے بندے ہو، بلکہ یہ ان ملاؤں کا وہ واحد پلیٹ فارم ہے جس پر ان کی جملہ مذہبی جماعتیں تو کیا تمام سیاسی جماعتیں بھی یکجا ہوجاتی ہیں۔ رہی انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کی بنیاد، یہ دھڑے بازی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ان لوگوں کی دور اندیشی کی مثال ہے۔''

بڑھے نے وھیل چیئر میں پڑے پڑے ہی اپنی بصیرت سے آگاہ کیا۔

''دور اندیشی؟ میں سمجھا نہیں انکل؟''

شفقت نے الجھے الجھے انداز میں پوچھا۔

''جب کسی آدمی کا کاروبار ترقی کرتا ہے تو دو باتیں وہ خاص طور پر سامنے رکھتا ہے۔ اول یہ کہ وہ اپنے کاروبار کو پھیلا کر دوسرے شہروں میں اس کی شاخیں قائم کردیتا ہے۔'' بڑھے نے توقف کیا تو شفقت نے بے چینی سے پوچھا۔

''اور دوسری بات؟''

''اور دوم یہ کہ وہ اپنی اولاد یا بھائیوں کو پروموٹ کرنے کی خاطر کاروبار کا آدھا بوجھ اُن کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے، تاکہ وہ بھی اپنی معیشت مضبوط کریں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔''

''تو اِس مثال کا مطلب؟''

''یعنی دور اندیش کاروباری ہر دو طرح سے اپنے کاروبار کو مشہور اور مضبوط کرتا ہے۔ اب دیکھو عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی شاخیں تو تقریباً پاکستان کے ہر بڑے شہر میں موجود ہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی...... اور اب یہ نئی جماعت کی تنظیم سازی...... گویا زیادہ سے زیادہ دماغوں اور صلاحیتوں کو استعمال میں لائے گی اور اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا گھیرا مزید تنگ ہوجائے گا۔''

''انکل! واقعی آپ تو بڑی گہری سوچ رکھتے ہیں۔''

''سوچ تو بہت گہری رکھتا ہوں مگر یہ ملّا نے نجانے کس مٹی کے بنے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں اس دوسری جماعت کے قیام سے ہمیں کیا نقصان ہوسکتا ہے؟''

شفقت کو فکر لاحق تھی۔

''بھئی دیکھو کسی مکان میں واردات یا تو داخلی دروازے سے ہوتی ہے جبکہ دربان نہ ہو یا پھر کسی خفیہ اور چور دروازے سے۔ اب دوسری جماعت کی موجودگی کا مطلب یہ ہوا کہ چوری کے تمام راستے بند ہوگئے اور گویا دو مورچے قائم ہوگئے۔''

بڑھے نے جواب دیا۔

''یہ آپ نے چور والی مثال کیوں دی؟ کیا ہم چور ہیں؟'' شفقت نے برا سامنہ بنایا۔

''او بچے! مثالیں سمجھانے کے لیے دی جاتی ہیں۔ ویسے تم چور کی بات کرتے ہو، وہ تو ہمیں ڈاکو کہتے ہیں ہاہاہا۔''

ہنستے ہوئے بڑھے کی جھریاں مزید ابھر آئیں۔

''کمال ہے آپ اتنی بری خبر سامنے آجانے کے بعد بھی قہقہے مار رہے ہیں؟''

''تو نے ہی راگ الاپا ہوا تھا خوش خبری کا...... کہتا تھا جوان ہوجاؤ گے جوان، حالانکہ اس خبر نے تو میرے دماغ کو بھی گویا مفلوج کردیا ہے۔''

بڑھے نے سر کو بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

اچھی خبریں

نظر سے گزرنے والی اکثر چوری، ڈکیتی اور قتل وغارت کی خبریں لاکھوں کروڑوں لوگوں میں سے صرف چند ایک کی ہوتی ہیں۔ اِس سے معاشرے کی اصل عمومیت سامنے نہیں آپاتی۔ سالہا سال ہم ہر وقت برائیوں کی خبریں سنتے رہتے ہیں تو ذہن میں عام آدمی کے بارے میں ایک برا تصور جم جاتا ہے۔ ہر شخص دوسرے آدمی پر شک اور بدگمانی کرتا ہے، جس سے خراب معاشرے کی مضبوط بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اصل حالات جاننے کے لیے بچوں کا اسلام کے ملک بھر میں پھیلے رپورٹر کی اچھی خبریں پڑھیے:

☆...... میرے امی نے کام والی کو تنخواہ دی تو ساتھ کچھ پیسے بطور عیدی بھی دیے۔ وہ پیسے لے کر نکلی اور وہ پیسے سامنے کھڑے چھان بورا بیچنے والے لڑکے کو ہدیے میں دے کر چلی گئی۔ (محمد وقاص۔ جھنگ صدر)

☆...... ایک بائیک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ غلطی بائیک والے ہی کی تھی، گاڑی والے کی کوئی غلطی بھی نہیں تھی، مگر اس نے اپنی قیمتی گاڑی اُدھر ہی چھوڑی اور بائیک والے کو دوسری گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ زخمی کی حالت بہت خراب تھی، مگر بروقت طبی امداد ملنے سے اُس کی جان بچ گئی۔ اسے تقریباً دس دن بعد ہوش آیا۔ اس دوران میں گاڑی والے مسلسل اس کی خبر گیری کرتے رہے اور اس کا لاکھوں روپے کا خرچہ بھی برداشت کیا، حالانکہ ان بے چاروں کی کوئی غلطی نہیں تھی، اور نہ ہی کسی نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ (طاہر محمود)

☆...... پچھلے ہفتے جب طوفانی بارشیں ہورہی تھیں۔ رات کو بلی کے رونے کی بہت زیادہ آوازیں آرہی تھیں۔ صبح ابو نماز کے لیے مسجد گئے تو آکر ہمیں قصہ بتا کر حیران کردیا۔ ابو کہنے لگے کہ رات کو بلی کے بالکل نومولود بچے بارش کے پانی میں بہہ رہے تھے، تبھی شاید وہ چلا رہی تھی، پھر ہمارے محلے میں پھرنے والے ایک پاگل سے فقیر کو جسے سب حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے کہ وہ شاید چوری وغیرہ کرتا ہے، اس نے بلی کے بچوں کی جان بچائی۔ خود بارش میں بھیگتا رہا مگر اپنا واحد پرانا سا کوٹ ان بچوں پر ڈال کر ایک مکان کے سایہ دار چھجے پر انھیں رکھ دیا تاکہ وہ محفوظ بھی رہیں اور مزید بھیگیں بھی نہیں۔ بلی کو سکون آگیا تو وہ اس چھجے پر اپنے بچوں کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی اور وہ آدمی ساری رات کھلے آسمان کے نیچے بھیگتا رہا۔ (بنت عمار خان۔ پشاور)

☆☆☆

پیغام کا راز

2

آئی جی غلام رسول زاہد

اُن کی ساری رات جاگتے ہوئے گزری تھی، لیکن اس کے باوجود سب پر جوش طاری تھا اور کسی قسم کی تھکن کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔

انسپکٹر کاشان نے اپارٹمنٹ میں ڈرائنگ روم کی میز پر گتے کا پیکٹ کھول کر اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔

اُن کے ساتھ خفیہ سراغرساں ادارے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ذوالفقار تابش بھی موجود تھے۔ خفیہ تحریروں کے ماہر ڈاکٹر کامران صمدانی بھی ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ سب کئی گھنٹوں سے اس پیکٹ کا جائزہ لے رہے تھے اور اس کے ذریعے دیے گئے خفیہ پیغام کو کھوج رہے تھے۔

''ابھی تک ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی، لیکن ہم ان شاء اللہ بہت جلد کامیاب ہو جائیں گے۔'' انسپکٹر کاشان مسکراتے ہوئے بولے:

سب انسپکٹر تیمور نے اُن کے لیے گرما گرم چائے اور ہلکا پھلکا ناشتا منگوالیا تھا۔

تازہ دم ہو کر سب اس میز کے گرد دوبارہ جمع ہو گئے۔

''ہم نئے سرے سے اس پیکٹ پر غور کا آغاز کرتے ہیں۔''

انسپکٹر کاشان نے پُرسکون لہجے میں گفت گو شروع کی۔

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں اِس پیکٹ میں سے دو کاپیاں اور دو کتابیں برآمد ہوئی ہیں۔ گتے کے پیکٹ پر کوئی تحریر یا نشان نہیں ملا۔ ہم اسکینر کی مدد سے گتے کی اندرونی تہوں کا جائزہ بھی لے چکے ہیں۔ کوئی خفیہ تہہ یا کاغذ نہیں ملا، لہٰذا یہ بات طے شدہ ہے کہ جو پیغام بھی دیا گیا ہے وہ صرف ان کاپیوں اور کتابوں ہی میں پوشیدہ ہے۔''

''جہاں تک کاپیوں کا تعلق ہے اُن کے سب صفحات بالکل خالی ہیں۔ خفیہ روشنائی کے ذریعے لکھی گئی کوئی تحریر بھی ان صفحوں پر موجود نہیں پائی گئی۔''

کامران صمدانی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''رہ گئیں پیکٹ میں سے ملنے والی دو کتابیں، تو ان میں سے ایک کتاب کا عنوان ہے: ''لاہور کے باغات اور مینار'' جب کہ دوسری کتاب مشہور ''قصہ چہار درویش'' ہے جس میں چار درویش اپنی اپنی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہ قصہ الف لیلہ کی شاہکار کہانیوں کا حصہ ہے۔'' انسپکٹر کاشان نے اضافہ کیا۔

''گزشتہ کئی گھنٹوں سے ہم اِن دونوں کتابوں میں درج تحریروں کا ہر زاویے سے جائزہ لے چکے ہیں، لیکن کوئی واضح اشارہ نہیں ڈھونڈ سکے۔ ظاہر ہے پیغام بھیجنے والے نے ضرور اسے کچھ اِس انداز میں خفیہ رکھا ہے کہ چند لمحوں کے اندر اندر اسے سمجھا جا سکے۔ تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور فوراً کارروائی شروع کر دی جائے۔ بات یقیناً بالکل سامنے کی ہو گی لیکن جب تک یہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے ہمارے لیے زندگی کا سب سے بڑا معمہ ہے!''

کامران صمدانی کے لہجے سے بے بسی جھلک رہی تھی۔

انسپکٹر کاشان نے باری باری دونوں کاپیوں کو اُٹھا کر دیکھا۔

ایک پر لیاقت نوٹ بک لکھا تھا، جبکہ دوسری کاپی پر جنت محل اسٹیشنرز درج تھا۔ اُنھوں نے دونوں کتابوں کو بھی باری باری غور سے دیکھا اور پھر ادل بدل کر دونوں کتابوں اور دونوں کاپیوں کا جائزہ لیتے رہے۔

''لاہور کے بارے میں کتاب ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ قصہ چار درویش کے ۱۲۰ صفحات ہیں۔ ایک کاپی ۱۵۰ صفحات کی ہے جبکہ دوسری کے صرف ۸۰ صفحے ہیں۔ ان اعداد سے بھی کوئی پیغام برآمد نہیں ہوتا۔''

ڈپٹی ڈائریکٹر ذوالفقار تابش نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا:

''ہم نے تو ان کتابوں کے عنوانات اور کاپیوں پر درج اداروں کے ناموں کے حروف بھی گن ڈالے ہیں، لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی۔ ان اعداد سے کوئی پیغام برآمد نہیں ہو پاتا۔'' کامران صمدانی گویا ہوئے۔ ''ان سے قاتلانہ حملے کی تاریخ اور مقام کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔''

ان دونوں کی گفتگو کے دوران انسپکٹر کاشان بڑے انہماک سے کتابوں اور کاپیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ سب انسپکٹر تیمور بڑی دلچسپی سے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔

''ایک منٹ!'' انسپکٹر کاشان یک دم بلند آواز میں بولے۔

اُن کی آنکھوں کی چمک سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُن پر کوئی اہم راز اچانک کھل گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نمبروں والے قفل مخصوص اعداد کی خاص ترتیب مکمل ہوتے ہی کھٹاک سے کھل جاتے ہیں۔

''جناب کامران صمدانی صاحب! کیا آپ قوسِ قزح کے رنگوں سے واقف ہیں؟''

وہ ڈرامائی انداز میں بولے۔

''بالکل واقف ہوں۔ میں نے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور فزکس میرا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔'' کامران صمدانی اس بہ ظاہر بے تکے سوال پر جز بز ہو کر بولے۔

''کیا آپ ان رنگوں کے نام ترتیب کے ساتھ اوپر سے نیچے کی طرف بتا سکتے ہیں؟'' انسپکٹر کاشان کی آواز میں جوش تھا۔

''کیوں نہیں!'' کامران صمدانی گہری سوچ میں نظر آ رہے تھے۔ اُن کی خفگی اب تجسس اور حیرت میں بدل چکی تھی، پھر وہ فر فر بولنا شروع ہو گئے۔

''سرخ، نارنجی، زرد، سبز، نیلا......''

''بس بس!'' انسپکٹر کاشان نے اُن کی بات کاٹ دی۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ میں صرف اپنی معلومات میں اضافے کے لیے یہ سوال کر رہا تھا۔ دیکھیے یہ کاپی جس پر لیاقت نوٹ بک لکھا ہے، اُس کا رنگ سرخ ہے۔ اس کے بعد قوسِ قزح کے رنگوں کی ترتیب کے لحاظ سے نارنجی رنگ آتا ہے۔ لاہور کے بارے میں کتاب کا سرورق نارنجی رنگ کا پس منظر رکھتا ہے۔۔۔ قصہ چہار درویش کے سرورق میں زرد رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اب رہ گئی یہ کاپی جس پر جنت محل اسٹیشنرز لکھا ہے تو قوس قزح کے رنگوں کی ترتیب کی رُو سے اگلا

رنگ کون سا ہے؟''

''سبز!'' کامران صمدانی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

سب حیرت سے انسپکٹر کاشان کے ہاتھوں میں کاپیوں اور کتابوں کو دیکھ رہے تھے۔

اُنھوں نے کاپی لہراتے ہوئے کہا۔

''اس کاپی کا رنگ گہرا سبز ہے جب کہ اس پر جنت محل اسٹیشنرز کے حروف سفید رنگ میں چھپے ہیں!''

''اس سے ہمیں ان کی ترتیب تو سمجھ میں آ گئی۔ یقیناً پیغام بھی اسی ترتیب میں چھپا ہے!'' ذوالفقار تابش بچوں کی طرح خوشی سے اُچھل کر بولے۔

''یہی تو اصل سوال ہے!'' انسپکٹر کاشان بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ سب میز پر قوسِ قزح کے رنگوں کی ترتیب سے رکھی ہوئی کتابوں اور کاپیوں کو دیکھ رہے تھے اور سوچ کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے۔ اِس سمندر سے سب سے پہلے انسپکٹر کاشان اُبھرے۔ اُن کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''لگتا ہے نمبروں والا تالا پھر کھل گیا ہے!''

سب انسپکٹر تیمور نے دل ہی دل میں سوچا۔

''ہمارے ملک کے پہلے وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کس تاریخ کو شہید ہوئے تھے؟......۱۶ اکتوبر!''

انسپکٹر کاشان نے خود ہی سوال کیا اور پھر خود ہی جواب بھی دے ڈالا۔

''میرے خیال میں ترتیب میں پہلے نمبر پر لیاقت نوٹ بک کے ذریعے یہی پیغام دیا گیا ہے۔''

''لیکن سولہ اکتوبر تو ابھی کئی مہینے دُور ہے، یہ تو مارچ کا مہینہ ہے جناب!''

سب انسپکٹر تیمور بے ساختہ بولے۔

''یہی اُلجھاؤ تو پیغام کو خفیہ رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے!''

انسپکٹر کاشان مسکرا کر بولے:

''قوسِ قزح کے رنگوں کے حساب سے دوسرے نمبر پر آتی ہے یہ کتاب، یعنی ''لاہور کے باغات اور مینار'' لاہور کے مینار سے فوراً ذہن میں مینارِ پاکستان آتا ہے۔ مینار پاکستان یادگار ہے قراردادِ پاکستان کی اور یہ قرارداد کون سے مہینے میں منظور ہوئی؟، جی ہاں! مارچ کے مہینے میں۔''

''اوہ میرے خدا!'' ڈپٹی ڈائریکٹر ذوالفقار تابش یک دم اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ''آج ۱۶/مارچ ہے!''

''اب تیسرے نمبر پر آتی ہے کتاب قصہٗ چہار درویش۔ یہ چار درویشوں کی سرگذشت کی کہانی ہے۔ ہفتے کا چوتھا دن کون سا ہے؟۔ سوموار سے گنتی شروع کریں تو چوتھا دن جمعرات بنتا ہے۔''

انسپکٹر کاشان پر گویا غیب سے انکشافات الہام ہو رہے تھے۔

''۱۶ مارچ یعنی آج جمعرات کا دن ہے!'' ذوالفقار تابش چیخ کر بولے۔

''پیغام دینے والے نے مزید تصدیق کے لیے خاص کیے گئے دن کا اشارہ بھی دیا ہے، اب رہ گیا مقام! تو یقیناً باقی رہ جانے والی اس سبز رنگ کی کاپی میں مقام کا اشارہ دیا گیا ہے، اسی سے یہ راز بھی کھل جائے گا کہ ہمارا دشمن ملک کی کس اعلیٰ شخصیت کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ میرے پاس صدرِ مملکت سمیت تمام اعلیٰ شخصیات کی اگلے پورے ہفتے کی مصروفیات کی تفصیل موجود ہے جو میں نے خاص اسی مقصد کے لیے حاصل کی ہے!''

اُنھوں نے اپنے ہاتھ میں اُٹھائی ہوئی فائل کھول کر میز پر سب کے سامنے رکھ دی۔

''اس کاپی پر جنت محل اسٹیشنرز کے الفاظ درج ہیں۔''

انسپکٹر کاشان رُک رُک کر بولے:

''تابش صاحب! آپ اس فہرست پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ اس فہرست میں کسی ایسے شہر یا مقام کا ذکر ہے جس میں جنت یا اس کے قریب قریب معنی کا کوئی لفظ آتا ہو!''

ذوالفقار تابش نے فائل کو سرکا کر میز کے درمیان میں کر دیا اور سب بے تاب ہو کر فائل میں رکھے ہوئے کاغذوں پر جھک گئے۔

چند منٹ کے بعد ذوالفقار تابش نے فائل میں ایک جگہ پر اُنگلی رکھ کر تقریباً سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''یہ رہا!......وزیرِ داخلہ سرفراز عظیم صاحب سولہ مارچ کو یعنی آج سہ پہر فردوس نگر میں ایک اہم تقریب میں شرکت کر رہے ہیں۔''

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولے:

''فردوس۔۔۔یعنی جنت!''

''وقت نہایت کم ہے! میں اس تقریب کو منسوخ کروانے کے لیے فوراً ضروری کارروائی کرتا ہوں۔۔۔آپ اپنا کام جاری رکھیں۔''

ذوالفقار تابش نے اپنے کاغذات سمیٹے اور تیزی سے باہر کی جانب لپکے۔

دوپہر کے وقت انسپکٹر کاشان کو ذوالفقار تابش کا فون موصول ہوا۔

''شکر ہے وزیرِ داخلہ رضامند ہو گئے ہیں۔ تقریب منسوخ کر دی گئی ہے۔ آپ نے اپنی ذہانت سے ایک بہت بڑے قاتلانہ حملے کو ناکام بنا دیا ہے!''

''یہ صرف اللہ کی مدد سے ممکن ہوا ہے جناب!''

انسپکٹر کاشان نے سکھ کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ روزمرہ معمول کا کام کر رہے تھے اور اپنے دفتر میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی کرسی سے اُٹھے تاکہ کچھ دیر آرام کرلیں۔ ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچے تھے کہ اچانک اُن کے ذہن میں جھماکا ہوا اور دفعتاً ایک ایسی خوفناک حقیقت اُن کے عین سامنے آ گئی کہ وہ بجلی کی تیزی سے پلٹے اور اپنی میز کی جانب بڑھے۔

اگلے ہی لمحے وہ ذوالفقار تابش کا فون ملا رہے تھے۔ (جاری ہے)

5 بدن

جلد کی رنگت اور بال

ترجمہ وتلخیص: سروہارا امبارکر

اگر جلد کا بالائی ایک ملی میٹر حصہ اتارا جائے تو یہ اِس قدر باریک ہوگا کہ کسی حد تک شفاف ہوگا۔ اور بس یہی سیاہ، سفید یا بھورا حصہ ہماری جلد کی رنگت ہے۔

انسانوں کی رنگت کا فرق صرف اسی بالائی اور بہت ہی پتلی سی تہہ سے ہوتا ہے۔

اور یہ غیر معمولی بات ہے کہ ہمارے بدن میں اس حصے کی اس خاصیت کو اتنی زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے کہ لوگ یہ خیال بھی کرتے رہے ہیں کہ اس کا کردار سے کوئی تعلق ہے، جبکہ یہ صرف دھوپ سے ہونے والا ردِعمل ہے۔ تاریخ میں اس کی وجہ سے انسانوں کی آزادی سلب کی گئی، انھیں مارا گیا اور ان کے حقوق چھینے گئے۔ اس سب کی بنیاد جلد کی بالائی پتلی سی پرت میں ہونے والا معمولی سا فرق رہا ہے۔

جلد اپنی رنگت کئی اقسام کی پگمنٹ سے لیتی ہے جن میں سب سے اہم مالیکیول میلانن ہے۔ یہ بائیولوجی کا قدیم مالیکیول ہے اور یہ صرف جلد کی رنگت کے بارے میں ہی نہیں، بلکہ یہی جز پرندوں کو اُن کے پروں کے رنگ دیتا ہے۔ مچھلیوں کو ان کا (texture) دیتا اور چمک فراہم کرتا ہے۔ اور جب آپ کے کاٹے ہوئے پھل بھورے ہوجاتے ہیں تو اس میں بھی اسی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ ہمارے بالوں کو بھی رنگت دیتا ہے۔ عمر کے ساتھ اس کی پیداوار ڈرامائی طور پر گر جاتی ہے تو بالوں میں چاندی اترنے لگتی ہے۔

ایک خیال ہے کہ جلد کی ہلکی رنگت ہجرتوں اور زراعت کا نتیجہ ہے۔ قدیم طرزِ زندگی والے لوگ بہت سا وٹامن ڈی مچھلی اور شکار سے حاصل کر لیتے تھے۔ جب فصلیں اگانا شروع کی گئیں تو خوراک تبدیل ہوگئی۔ خاص طور پر خطِ استوا سے شمال کے سفر میں جلد کی ہلکی رنگ مفید تھی کیونکہ اس سے اضافی وٹامن ڈی اخذ کیا جاسکتا تھا۔

وٹامن ڈی صحت کے لیے ضروری ہے۔ یہ مضبوط ہڈیوں اور دانتوں میں مدد کرتا ہے۔ امیون سسٹم کے لیے مفید ہے۔ کینسر سے لڑائی اور دل کی دیکھ بھال میں اس کا اہم کردار ہے۔ ہم اسے دو طریقے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ خوراک سے یا دھوپ سے۔

دھوپ کے ساتھ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اُس کا الٹراوائلٹ حصہ خلیے کے ڈی این اے کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور جلد کا کینسر کرسکتا ہے۔ ٹھیک ٹھیک توازن کوئی آسان کام نہیں۔

ہم اپنی جلد کا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ دھوپ میں کالے ہوجاتے ہیں۔ شرم سے لال ہوجاتے ہیں۔ غصے میں چہرے کی سرخی کی وجہ ہمیں معلوم نہیں۔ جب جسم لڑنے کو تیار ہو تو عام طور پر یہ خون کو اُن جگہوں کی طرف زیادہ بھیجنے لگتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے۔ یعنی پٹھوں میں تو

پھر یہ خون چہرے کی طرف کیوں آجاتا ہے؟ معلوم نہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اس کی ایک ممکنہ وجہ حریف کو یہ سگنل دینا ہوسکتی ہے کہ آپ واقعی غصے میں ہیں۔

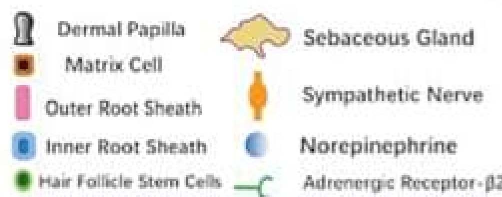
شمالی خطوں، جیسا کہ کینیڈا یا شمالی یورپ، میں یہ ممکن نہیں کہ سردیوں کے مہینوں کے کمزور سی دھوپ سے مناسب مقدار میں وٹامن ڈی حاصل کیا جاسکے، خواہ رنگت کتنی ہی گوری کیوں نہ ہو۔ انڈے، پنیر اور مچھلی کا تیل اس مقدار میں نہیں کھایا جاسکتا کہ یہ کمی پوری ہو۔ کئی جگہوں پر دودھ میں اضافی وٹامن ڈی ملایا جاتا ہے، لیکن اس وقت عالمی طور پر نصف آبادی کم از کم سال کا کچھ حصہ وٹامن ڈی کی کمی کا شکار رہتی ہے۔

جلد کی ہلکی رنگت کے سوا ہلکے رنگ کے بال اور آنکھیں وٹامن ڈی میٹابولزم پر اثر نہیں ڈالتے، اور ان کا کوئی عملی فائدہ نہیں لگتا۔ اگر آپ کی آنکھ نیلی یا سبز ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ آنکھ میں یہ رنگ زیادہ ہیں بلکہ یہ کہ دوسرے رنگ کم ہیں جس وجہ سے آنکھ نیلی یا سبز لگتی ہے۔

بال:

جلد دو اقسام کی ہے۔ بالوں کے بغیر جلد کو گلابروس کہا جاتا ہے اور یہ بہت کم ہے۔ ہونٹ، ہتھیلی اور تلووں پر بال نہیں ہوتے۔ یا تو بڑے بال (Terminal hair) ہیں، جیسا کہ ہمارے سر پر یا پھر روئیں دار (vellus hair) جیسا کہ بچے کے گال پر۔ اندازہ ہے کہ ایک شخص کے بدن پر بالوں کی تعداد پچاس لاکھ ہوتی ہے۔

رینگنے والے جانور، مچھلیاں، کیڑے وغیرہ بال نہیں رکھتے۔ بال صرف ممالیہ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ یہ جاندار کو گرم رکھتے ہیں، کشن دیتے ہیں، چھپنے میں مدد کرتے ہیں۔ جسم کو الٹراوائلٹ شعاعوں سے بچاتے ہیں۔ گروپ کے ممبران کو سگنل کرنے کے کام آتے ہیں۔ جیسا کہ غصے کا، لیکن انسانوں میں ان کے یہ فیچر



زیادہ کارآمد نہیں۔ کیونکہ ہمارے بال بہت ہی کم ہیں۔

تمام ممالیہ میں سردی لگنے کی صورت میں بالوں کی جڑوں کے قریب پٹھے سکڑتے ہیں۔ اس عمل کو (horripilation) کہتے ہیں۔ یہ عمل انسانوں میں بھی ہوتا ہے۔ بالوں سے بھرے ممالیہ میں اس طریقے سے جلد اور کھال کے درمیان انسولیٹ کرنے والی مفید ہوا پھنس جاتی ہے، لیکن انسانوں میں اس کا کوئی فزیولوجیکل فائدہ نہیں۔ کیونکہ باقی ممالیہ کے مقابلے میں ہم تقریباً گنجے ہیں۔ یہی عمل اس وقت ہوتا ہے جب خطرہ ہو۔ اس سے جانور اپنے سائز سے زیادہ بڑا اور خوفناک لگتا ہے۔ ہمارے بھی خطرے کے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن کم بالوں کی وجہ سے یہاں پر بھی ہمیں وہ فائدہ نہیں ہوتا جو دوسرے ممالیہ جانداروں کو ہوتا ہے۔

جسم کے ہر بال کا بڑھنے کا اپنا خاص سائیکل ہے۔ پہلے بڑھتے رہنا اور پھر رک جانا۔

چہرے کے بالوں کے لیے یہ چار ہفتے میں مکمل ہو جاتا ہے۔

سر کا ایک بال آپ کے ساتھ چھ سے سات سال رہتا ہے۔ بال روزانہ تقریباً ایک تہائی ملی میٹر بڑھتے ہیں، اور اس رفتار کا انحصار عمر اور صحت پر ہوتا ہے۔ سال کے موسموں سے بھی فرق پڑتا ہے، لیکن ہم اس چیز کو عام طور پر اسی وقت نوٹ کرتے ہیں جب بال گر رہے ہوں۔ (جاری ہے)

اشک کی برسات میں

اثر جونپوری

دن میں سوتا جاگتا ہوں رات میں
مجھ سے ملیے رات کے اوقات میں
کیونکہ میں فی الحال نومولود ہوں
آ نہیں سکتا ہر اک کے ہاتھ میں
ہنس رہے ہیں لوگ مجھ کو دیکھ کر
رو رہا ہوں میں جبھی ہر بات میں
بند کر کے آنکھ، کر کے گول منہ
غور کرتا رہتا ہوں حالات میں
گو ابھی آیا ہوں دنیا میں مگر
ہاں ابھی سے ہی اجل ہے گھات میں
کس طرح رب نے بنایا ہے مجھے
غور کیجیے رب کی تخلیقات میں
چشمِ عارف مانگیے اللہ سے
دیکھیے صانع کو مصنوعات میں
سہہ رہا ہوں غم زمانے کے جبھی
بہہ رہا ہوں اشک کی برسات میں

الف نمبر کا جائزہ اور تبصرہ

مدیر کی میز پر

کچھ کہانیاں اپنے مضبوط مرکزی خیال کی وجہ سے کمزور اُسلوب کے باوجود اپنا ایک مقام بنالیتی ہے۔ آصف مجید کی گورکھ دھندا بھی ایسی ہی تحریر ہے۔ تحریر کا عنوان قاری بوتا ہوتا تو مزید انفرادیت آجاتی۔ مکافات عمل کے حوالے سے ایک اچھی تحریر ہے۔

الف نمبر میں مدیر صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قلمکاروں سے آئیڈیاز کا اشتراک کر کے اچھی تحریریں لکھوالیں۔ رانا محمد شاہد کا مضمون قدرتی وسائل سے مالا مال دریا خاصے کی چیز ہے۔

محمد اسامہ سرسری استقامت کی علامت ہیں۔ محنتی ہیں اور محنت کا پھل بھی پاتے ہیں۔ لفظ سیریز میں اسلام اور ہزار کی بابت بحث کرتے ہوئے کچھ سمجھاتے ہیں۔ کیا آپ کو کچھ سمجھ آیا؟ پیارے قارئین ساتھیو! اگر نہیں آیا تو تحریر ایک بار پھر پڑھیے۔

ارے یہ م ف ش کون ہیں؟ آہم سمجھ گئے، محمد فیصل شہزاد! انڈے سے آپ مدیر محترم کی محبت ملاحظہ کیجیے کہ اس کے اتنے فوائد بتائے ہیں کہ گویا انڈا نہ کھایا تو حال برا کروایا، لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ آج کی تاریخ تک انڈا/روپے پار کر چکا ہے۔ جب سستا ہوگا تو ہم دن رات اس کا استعمال کریں گے، وعدہ رہا!

سنہری بلی، کیا ہی مزے دار تحریر ہے۔ ابن آس کو اپنے کرداروں کو متحرک کرنا آتا ہے۔ وہ کہانی کو مکالمے سے شروع کر کے مکالمے پر ختم نہیں کرتا بلکہ کہانی کے کردار اتنے متحرک ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنی توجہ کو یکسو کرنا پڑتا ہے۔

بچوں کے اردو ادب میں صدیقی خاندان کا نام یقینا یاد رکھا جائے گا۔ اس فیملی کی سب سے سینئر ادیبہ کی تحریر 'ماروں گا طمانچہ کھینچ کر' الف نمبر کی زینت بنا ہے۔ سیما صدیقی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نوعمر بچوں کے لیے جس طرح کہانی بنتی ہیں، اس کا سبق کئی برسوں تک دماغ میں نقش رہتا ہے۔ ان کا پلاٹ جاندار ہوتا ہے۔ یہ تحریر بھی بچوں پر گہرے اثرات مرتب کرے گی۔

اعظم طارق کوہستانی

سید عبیداللہ حسنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی سیرت کے روشن جھروکے قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک اچھی اور معلوماتی تحریر جو اسلاف سے محبت کا باعث بنی۔ حافظ حمزہ شہزاد ایک اچھے قلمکار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سرور مجذوب کی جھلک نظر آتی ہے۔ تحریر کا بنیادی فلسفہ بڑا خوش کن ہے لیکن ایسی مثالیں ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں، بلکہ کروڑوں میں کہیں ملتی ہے۔ ہوائیں تحریر میں انیسہ عائش کا ہوا سے متعلق خیال درست ہے کہ یہ ایک ہوا نجانے کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ الف نمبر میں شاہد حفیظ کی شرکت ایک سفرنامے سے ہو رہی ہے۔ راستے کی مشکلات کا تذکرہ اور بعد ازاں لال سوہا نرا پارک کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔ انکل جعفر کو سلام کہیے گا کہ کیا اچھا نام دیا ہے: لال چھوہارا پارک۔ ڈاکٹر سارہ الیاس پرانے لکھاریوں میں سے ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف نوعمر بچوں کے لیے بلکہ چھوٹے بچوں کے لیے بھی بہت اچھی اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ جھولا تحریر میں انھوں نے ماضی کی یادوں کو کریدا ہے۔ اس تحریر سے چھوٹے بچے شاید اتنے محظوظ نہ ہوئے ہوں جتنا بڑوں کو اس نے اپنا بچپن یاد دلایا ہے۔ ب سے بہادری میں عبدالرشید فاروقی

دو گدھے

برہم مروت

روزگار کی خاطر میں نے کسی باہر ملک جانے کے لیے کوششیں تیز کر دیں، جس میں بالآخر مجھے کامیابی ملی۔ روانگی والے دن میرے والد نے بہت ساری دعاؤں اور پند و نصائح کے ساتھ مجھے الوداع کہا۔

پردیس میں کام کاج اور کمائی میری توقع کے مطابق نہ تھی اور مجھے مشکلات سے لڑتے لڑتے دو سال بیت گئے اور میں گھر کچھ بھی نہ بھیج سکا۔

اُدھر دو سال کے بعد گاؤں میں ایک دن میرے والدین کہیں گئے ہوئے تھے کہ گھر میں چور آ گیا۔ ہمارے گھر میں اور ایسا کچھ تو تھا نہیں کہ چور کے کام آتا، ہمارا ایک گدھا گھر میں بندھا کھڑا تھا، چور وہی کھول کر لے گیا۔ دو دن کے بعد چور ہمارے گدھے کو لے کر بازار بار برداری کے لیے لے گیا۔ پھل اور سبزیوں سے لادا۔ بھیڑ کی وجہ سے چور کی توجہ کہیں اور مبذول ہوئی تو گدھا چل پڑا۔

ہمارے گھر کا راستہ تو گدھا جانتا ہی تھا، اس لیے اس نے شام کو دروازے پر آ کر منہ مارنا شروع کر دیا۔ اپنی کل متاع گدھے کی چوری سے غم زدہ میرے والد سمجھے، کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ جا کر دروازہ کھولا تو سامنے اپنے گمشدہ گدھے کو پھلوں اور سبزیوں سے لدا پھندا کھڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

میری اماں کو بلا کر دکھاتے ہوئے کہا:

''دیکھ! یہ میرا گدھا دو دن غائب رہا ہے اور بدلے میں پورا بازار لے کر آیا ہے اور ایک تیرا گدھا ہے جس کو گئے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں اور آج تک ایک پیاز کا دانہ بھی نہیں بھیج سکا ہے۔''

ملاحظہ: یہ عربی سے منقول قصہ ہے، اِس لیے اس تحریر میں ''میں'' سے مراد ''میں'' ہرگز نہیں ہوں۔

☆☆☆

اے اللہ!

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِمَّا عِنْدَکَ وَاَفِضْ عَلَیَّ مِنْ فَضْلِکَ وَانْشُرْ عَلَیَّ مِنْ رَحْمَتِکَ وَاَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَکَاتِکَ۔

(حیاۃ الصحابہ)

اے میرے اللہ! میں ان نعمتوں میں سے مانگتا ہوں جو تیرے پاس ہیں اور اپنے فضل کی مجھ پر بارش فرما اور اپنی رحمت مجھ پر پھیلا دے اور اپنی برکت مجھ پر نازل کردے۔

صاحب نے بہادری کے حوالے سے بچوں کو اچھی ترغیب دی۔ اس طرح کی مہماتی قسم کی کہانیاں بچوں کو پسند آتی ہیں۔ عبداللہ مسافر گھوڑے کے حوالے سے ایک اہم معلوماتی لیکن دلچسپ مضمون پیش کر رہے ہیں۔ اگلے صفحات پر سیرت فاروق ﷺ کا تذکرہ ہے جس وقت ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں یہ حضرت عمر فاروق کی شہادت کا دن ہے۔ ایک زمانے تک حضرت عمر فاروق کا نام سنتے ہی دل میں ہیبت وجلال کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی لیکن جب سیرت عمر فاروق کو پڑھا تو وہ ہیبت محبت میں بدل گئی۔ آپ پر سلامتی ہو کہ آپ نے دین کا بول بالا کیا۔

ایک صفحے پر مشتمل عامرہ احسان کی تحریر درشنی بلا بلاشبہ غور وفکر میں مبتلا کرنے والی تحریر ہے۔ عامرہ احسان کی تحریروں میں اس چیز کا خاص التزام نظر آتا ہے کہ وہ کاٹ دار انداز سے برائیوں کی بیخ کنی کرکے دل ودماغ کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔

پروفیسر اسلم بیگ بہت ہی عمدہ بات کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں۔ یقیناً صاف دل لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ان کی باتیں دل میں ترازو ہوجاتی ہیں۔

شکیل شریف ویسے تو روایتی قلم کار نہیں ہیں لیکن خاص شمارے میں ان کی خاص تحریر مختصر مگر دلچسپ ہے اور ایسے واقعات کا پٹارا ان کے پاس ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ ذرا ان سے ملیے تو سہی۔ ہارون الرشید عادل صاحب کی اٹھائیس گھنٹے کی نیند کا واقعہ بھی کیا یادگار واقعہ ہے۔ غصہ بھی آیا اور بہت زیادہ ہنسی بھی۔ اللہ ایسی نیند سے بچائے۔ ہارون الرشید بھائی ایک زندہ دل انسان ہیں۔ اللہ نے ڈھلتی عمر کے ساتھ انھیں مزید خوب سے خوب تر بنایا ہے اور اس بات کا انھیں ذرا بھی گھمنڈ نہیں ہے۔ اپنی شخصیت کی طرح انھوں نے خوب صورت تحریر رقم کی۔

حماد احمد نے ست الوجود لکھ کر سستی اور کاہلی پر کمال آپ بیتیاں پیش کیں۔

مختار کندی کی تحریر جیسے کو تیسا شاید ہم پہلے کہیں پڑھ چکے ہیں۔ کیا ہی خوب صورت تحریر ہے۔ مزے دار، شان دار!

ابن یوسف کی تحریر پاکستان کی بلند ترین چوٹیاں معلومات سے پر ہے۔

خالہ ثریا بنی جاسوسہ نام ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ خالہ جان کیا گل کھلانے والی ہیں۔ الف نمبر کی اچھی تحریروں میں سے ایک تحریر! یہ سلسلہ آگے بڑھایا جاسکتا ہے ہمارے ہاں زیادہ تر جاسوس مرد حضرات بنتے ہیں۔ ایک بین الاقوامی جاسوسہ خاتون کا ہونا ضروری اس لیے ہے کہ یہ خواتین کا پیدائشی اور بنیادی حق ہے۔

اختر عباس نے ۱۳ سال پھول جیسے رسالے کی ادارت کی، اس زمانے میں پھول کیا ہی دلکش نکلا کرتا تھا۔ اختر عباس نے بچوں کے لیے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں ان کی یہ تحریر سورج مکھی کا پھول کتنی مزے دار ہے۔ پڑھتے ہوئے کتنا لطف آرہا ہے۔

ماہنامہ ذوق وشوق کے مدیر عبدالعزیز بھائی بہت نفیس انسان ہیں اسی طرح ان کا سفرنامہ تاخاک بخارا میں انھوں نے ازبکستان کا احوال تحریر کیا ہے سفرنامہ معلوماتی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

سیرت عثمان کا تذکرہ بھی سوال وجواب کی صورت موجود ہے۔ قرات عمیر نے فلاحی دسترخوان کے ذریعے ایک اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ فلاحی دسترخوانوں نے بے شک معاشرے کو خرابی سے دوچار کیا ہے۔ اس میں زیادہ قصور حکومت وقت کا ہے۔ فلاحی اداروں کو بھی چاہیے کہ وہ افراد کو ہنر سکھائیں اور بجائے کھانے پر انھیں کمانے کی ترغیب دیں۔

پوری دنیا اس وقت پانی کے حوالے سے پریشانی کا شکار ہے، شازیہ نور صاحبہ نے اس اہم مسئلے پر شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا ہی سے بچوں کو پانی کی اہمیت بتانی چاہیے تاکہ وہ نہر کے کنارے بھی بیٹھے ہوں تو اسراف نہ کریں۔

چچا بھلکڑ، ذکیہ بلگرامی کا مشہور کردار ہے۔ چچا چھکن طرز پر لکھی گئی اس تحریر میں چچا جان اپنا ہی بچہ بھول آتے ہیں۔ آپ بھی اپنے آس پاس نظر دوڑایئے ایسے چچا آپ کو کہیں نہ کہیں نظر آہی جائیں گے۔

عصمت چغتائی نے ادب اطفال میں اپنی نٹ کھٹ کہانیوں سے جو رونق لگائی ہے وہ انھیں مدتوں زندہ رکھے گی۔ ان کی ہر تحریر بڑی مزے دار ہے۔ روٹی کی بارات میں انھوں نے روٹی کے عروج وزوال کی کیا خوب منظر کشی کی ہے۔

مہرو باجی اور زید، کاشان صادق کی ایک خوب صورت کہانی۔ جانوروں کو ستانے پر اردو میں بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ یہ کہانی بھی اسی موضوع پر ہے لیکن اچھی اور خوب صورت تحریر ہے۔

ستونت کور کی تحریر پاکستان کا خوب صورت چہرہ میں اہم معلومات کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ طالب علموں کے لیے توشہ خاص ہے۔

پھولوں سے گلدستے تک (وقار عثمان (نیکی کی ترغیب دیتی ایک اچھی کہانی ہے۔ اچھے لوگ ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ تھوڑی سی محنت اور تھوڑی سی توجہ بہت سی مشکلات کو ختم کردیتی ہے۔ تحریر میں سرور مجذوب کی جھلک نظر آئی۔

اگر میں اپنی پسندیدہ نظموں کی ایک فہرست مرتب کروں تو یقیناً صفدر علی صفدر کی یہ نظم ذرا سوچو تو کیا ہوگا کو اس میں جگہ دوں گا۔ کتنا خوب صورت پیغام دے رہے ہیں۔ صفدر علی صفدر جیسے شاعروں سے خصوصی طور پر بچوں کے لیے نظمیں لکھوانی چاہییں۔

سرفروش پڑھ کر ایک لمحے کے لیے ہمیں لگا کہ ہم نسیم حجازی کو پڑھ رہے ہیں لیکن اگلے صفحے پر تیر انداز مجاہد کے ساتھ رفعت سعدی کا نام بطور قلم کار جگمگا رہا ہے۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتی یہ تحریر یقیناً دل میں نئی امنگوں کو جگائے رکھتی ہے۔ الف نمبر کی شان ایسی تحریروں نے ہی بڑھائی ہے۔

اپنے مختصر لیکن پر اثر مضمون غرناطہ میں محمد اشرف نے اہم باتوں کی جانب توجہ مبذول کروائی۔ غرناطہ رومی زبان میں انار کو کہتے ہیں یہ بات اس تحریر کے ذریعے پتا چلی۔

☆☆☆

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا جانور کون سا ہے؟
شاید آپ فوراً کہہ اٹھیں: ہاتھی!
جی نہیں، دنیا میں رہنے والا سب سے بڑا جاندار نیلی وہیل ہے، جس کی صرف زبان کا وزن ہی ایک جوان ہاتھی کے برابر جبکہ دل کا وزن ایک کار کے برابر ہوتا ہے۔

نیلی وہیل

ویسے شاید یہ بات بھی آپ کے لیے حیران کن ہو کہ وہیل ایک مچھلی ہونے کے باوجود ممالیہ جاندار ہے۔ جی ہاں! عموماً مچھلیاں انڈے دیتی ہیں، وہیل مچھلی بچے دیتی ہے اور انھیں دودھ بھی پلاتی ہے۔

نیلی وہیل ۱۰۰ فٹ (تیس میٹر) تک لمبی ہوسکتی ہے۔ یہ اتنی بڑی ہوتی ہے کہ



اسے آسانی کے ساتھ تولا بھی نہیں جاسکتا۔ اسی لیے پہلے اس کے ٹکڑے کیے جاتے ہیں، اس کے بعد ان ٹکڑوں کو تولا جاتا ہے لیکن پھر بھی خون بہہ جانے سے وہیل کا اصل وزن اندازے سے ہی معلوم کیا جاتا ہے۔

اب تک کی سب سے وزنی وہیل کا وزن ۲۰۰ ٹن ریکارڈ کیا گیا ہے (ایک ٹن میں ہزار کلوگرام ہوتے ہیں)۔ نیلی وہیل کی صرف زبان کا وزن ہی تین ٹن ہوسکتا ہے جو عموماً ایک جوان ہاتھی کا وزن ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ دل کا بتایا کہ اس کا دل مہران کار کے جتنا بڑا ہوسکتا ہے۔ ان کا جہازی سائز کا دل ایک منٹ میں آٹھ سے دس مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اور اس کی ہر دھڑکن کو دو میل دور سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نیلی وہیل کی رگیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ ایک بالغ انسان اُن میں بہ آسانی تیر سکتا ہے۔

پیدائش کے وقت نیلی وہیل کے بچھڑے کا وزن تقریباً ستائیس سو کلو اور لمبائی ۲۵ فٹ تک ہوسکتی ہے۔ یہ گویا اِس دنیا کا سب سے بڑا نومولود بچہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے بڑا ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے پہلے چھ مہینوں تک وہیل کا بچہ ہر روز ۴۰۰ لیٹر دودھ پیتا اور تقریباً ۹۰ کلو ہر دن اپنا وزن بڑھاتا ہے۔

عام طور پر وہیل ۲۰ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہیں، لیکن وہ ۵۰ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار تک بھی پہنچ سکتی ہیں۔

ویسے ہم تو انھیں نہیں سن سکتے، کیونکہ ہمارے کان آواز کی اُس فریکوئنسی کو نہیں سن سکتے، لیکن وہیل اس دنیا کی سب سے زیادہ شور مچانے والی جانور ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے آواز سے ہی رابطہ کرتی ہیں۔ ایک وہیل مچھلی دوسری وہیل مچھلی کی آواز سولہ سو کلومیٹر دور سے بھی سن سکتی ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کے وہیل مچھلی کم وبیش ۸۰ سال تک زندہ رہ سکتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کے اتنا بڑا جانور ہونے کے باوجود بھی وہ کسی بڑے سمندری جانور کا شکار نہیں کرتیں، بلکہ ان کی غذا بہت ہی چھوٹی ہے جسے کرل کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا کیڑا ہوتا ہے۔

ایک جوان نیلی وہیل ہر روز تقریباً چار ٹن کرل کھاتی ہے۔

نیلی وہیل ایک بار مکمل منہ کھول لے تو ۹۰ ٹن خوراک اور پانی منہ میں بھر سکتی ہے۔

جبکہ وہ ایک نوالے میں ۶۰۰ کلوگرام کرل (Krill) یا چھوٹی مچھلیاں کھاسکتی ہے، جس میں ۴ لاکھ ۷۵ ہزار کیلوریز ہوتیں ہیں۔

قدرت کا کرشمہ نیلی وہیل ایک عجوبے سے بڑھ کر ہے۔ ان کی کھوپڑی بھی کافی بڑی ہوتی ہے اور دماغ بھی، لیکن سوچنے سمجھنے یعنی تھاٹ پراسس کی صلاحیت ہمارے پاس ان سے کہیں زیادہ ہے۔

☆☆☆

انتخاب: علیم اعلم ۔ لاہور